امت مسلمہ کی بحالی اور اقبال کا فلسفہ تعلیم و عمل: ڈاکٹر عبدالحق کے نقطۂ نظر کا جائزہ

Restoration of Muslim Ummah and Iqbal's Philosophy of Education and Practice: *Dr. Abdul Ḥaq's* Perspective

Aamir Mahmood

Doctoral Candidate Urdu, Allama Iqbal Open University, Islamabad/ Lecturer Urdu, Superior College Rawalpindi

Dr. Mohib ul Nabi Tahir

Assistant Professor of Islamic Studies, Govt. Graduate College, Nankana Sahib

Serfraz Hussain Saeed

PhD Scholar Islamic Studies, University of Gujrat, Gujrat

Abstract

Prof. Dr. Abdul Haq is a well-known Iqbal scholar. He has been the President of the Department of Urdu, Delhi University. He has written more than 40 books. In recognition of his scholarly services, he was awarded the title of Professor Emeritus. Among the aspects of Iqbal's thought which he has highlighted regarding the rebirth of the Muslim Ummah, the subject of education is at the forefront. Iqbal is a staunch supporter of modern education and seems to emphasize the need and importance of self-training and character building along with education. He is in favor of formulating a curriculum for the Muslim Ummah which will play a key role in instilling in them a sense of self and a sense of earthly caliphate. Another aspect of the revival of the Muslim Ummah is the acquisition of power. The source of gaining power lies in the philosophy of jihad, by following which man can fight the internal and external forces of evil. The last thing that Dr. Abdul Haq has

drawn from Iqbal's thought is the philosophy of action. Muslims will be able to maintain their identity only after playing their full role in the field of science and technology.

Key Words: Iqbal's Thought, modern education, self-Training, curriculum, acquisition, philosophy, Science, technology

تمہید

بر صغیر پاک و ہند میں متعدد اہل قلم ماہر اقبال کے خطاب سے نوازے گئے۔ ان میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جو اقبال کے مقام و مرتبے اور فکر و فن سے شناسا ہیں۔ پروفیسر عبد الحق کا شمار بھی انھی ماہرین اقبال میں کیا جا سکتا ہے جو کہ ساتھ ساتھ اقبال کے فکر و فلسفہ کے باہمی امتزاج کو سمجھنے اور پھر اسے پیش کرنے کے سلیقے سے بھی آگاہ ہیں۔ پروفیسر عبد الحق ضلع جون پور کی تحصیل مچھلی شہر کے ایک خوبصورت گاوں پہاڑ پور میں پیدا ہوئے۔ گاوں سے ابتدائی تعلیم کے بعد مچھلی شہر کے ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ آپ نے گور کھپوری یونی ورسٹی سے بی۔اے اور ایم۔اے اردو کیا۔ علی گڑھ یونی ورسٹی سے فارسی زبان میں ایم اے کیا۔ مجنوں گور کھپوری اور ڈاکٹر محمود الٰہی جیسے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ مخطوطہ شناسی میں ڈپلومہ کیا۔ تحقیقی مقالہ "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" مکمل کر کے پی۔ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی جو ہندوستان میں اقبالیات پر پہلا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے۔ آپ نے دہلی یونی ورسٹی میں لیکچرار، ریڈر اور پھر پروفیسر کے عہدوں پر کام کیا۔ دس سال شعبہ اردو میں پروفیسر رہے۔ کشمیر یونی ورسٹی اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر بھی کام کیا۔ پروفیسر عبد الحق نے کافی بیرونِ ملک کے سفر بھی کیے۔ جن میں پاکستان، لیبیا، ماریشس وغیرہ شامل ہیں۔ آپ کی نگرانی میں حد سے زیادہ طلبہ و طالبات ایم فل اور پی۔ایچ ڈی کے مقالے لکھ چکے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں پی۔ایچ ڈی کے ممتحن بھی رہ چکے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں پروفیسر عبد الحق کی علمی اور ادبی خدمات پر ایم فل اور پی۔ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ پروفیسر عبد الحق کو ان کی علمی و ادبی کاوشوں کی بنا پر انھیں پروفیسر ایمرسن کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ چالیس سے زیادہ تصانیف لکھ چکے ہیں جن میں کئی ایسی کتابیں ہین جن کے ایک سے زائد ایڈیشن بھی آ چکے ہیں۔ اقبال شناسی کے حوالے سے بر صغیر پاک و ہند میں اپنا منفرد مقام حاصل کر چکے ہیں۔ اقبال پر ان کی اہم کتابوں میں "اقبال اور اقبالیات"، "اقبال شاعر رنگین نوا"، "اقبال کا حرف شیریں"، "اقبال کے شعری اسالیب"، "اقبال کے شعری و فکری جہات"، "بکھرے خیالات" زیادہ اہم ہیں۔ پروفیسر عبد الحق، اقبال پر 10 سے زیادہ تصانیف لکھ چکے ہیں۔ پروفیسر عبد الحق ایسے سنجیدہ اقبال شناس ہیں کہ ان کی اقبال شناسی صرف عقیدت مندی تک ہی محدود نہیں بل کہ فکرِ اقبال میں علم و شعور، تاریخ و تہذیب، فکر و فلسفہ کے متعدد زاویے اور پہلو ان کے مضامین میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اقبال شناسی کے باب میں ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "اقبالیات کا تنقیدی

جائزہ" کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں پروفیسر عبدالحق نے اقبال کے ابتدائی کلام کی چھان بین کرنے کے بعد اقبال کے ابتدائی افکار کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ جس سے آپ اقبال سے متاثر ہو کر اقبال کی محبت میں ایسے ڈوبے کہ فکرِ اقبال کے ترجمان بن گئے۔ اسی وجہ سے آج صرف ہندوستان ہی نہیں بل کہ پوری دنیا میں پروفیسر عبدالحق بطور اقبال شناس جانے جاتے ہیں۔ پروفیسر علی احمد، پروفیسر عبدالحق کی اقبال شناسی کے حوالے سے رقم طراز ہیں: "پروفیسر عبدالحق گزشتہ کئی دہائیوں سے مطالعہ اقبال میں غرق ہیں اس لیے اپنے بلیغ اور باکمال جملے فطری اور فکری انداز میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں جس سے ان کی وسیع النظری اور ادراک وآگاہی کا غیر معمولی اظہار ہوتا ہے پھر ایک منزل یہ آتی ہے کہ حامد اور ممدوح ایک نقطہ ارتکاز پر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔"[1] اقبال کے فکر و فن کی تفہیم و تشریح کے ساتھ پروفیسر عبدالحق کی ذہنی اور جذباتی وابستگی کے باوجود ان کی تحریروں میں غیر جانبداری کا انداز نظر آتا ہے جو کہ ان کو دوسرے اقبال شناسوں سے منفرد و ممتاز بناتا ہے۔ پروفیسر عبدالحق کے خیال میں اقبال نے ایک پژمردہ قوم اور زوال پذیر معاشرہ کے نوجوانوں کو ہی اپنا مخاطب اولین قرار دیا ہے اور تمام تر امیدیں انھی سے وابستہ کی ہیں اقبال کو ان کی قوتِ بازو میں عزم و ارادے کی جو بے پناہ کشش محسوس ہوتی ہے اسی قوت سے انقلاب لانا چاہتے تھے۔ اقبال کے فکر و نظر کا کارواں ہمیشہ آگے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے اس کی رفتار اور منزل کے تعین میں تو اختلاف ہو سکتا ہے مگر ارتقا پذیری سے اختلاف ناممکن ہے۔

پروفیسر عبدالحق کی نظر میں اقبال کی عظمت کا راز ان کے فکر و شعر کے آفاقی انداز میں پوشیدہ ہے۔ دنیائے ادب میں ان کی انفرادیت اسی وجہ سے قائم ہے۔ اقبال کے سخن میں سوز اور لب و لہجے میں کرب ناکی اسی فکر و گہرائی کے کسب و کمال کا نتیجہ ہے۔ آفاقی شاعری کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ اس میں زندگی اور کائنات کے موضوعات بکثرت موجود ہوں کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ چند مضامین کی ترجمانی سے عظیم فن کی تخلیق ممکن نہیں ہے۔ محدود تصورات بھی فنکار کی عظمت کے منافی ہیں۔ خیال کی وسعتوں کو لفظوں اور لکیروں میں پیوست کرنا ہی فن کی معراج ہے۔

فلسفہ تعلیم وتربیت

پروفیسر عبدالحق کے بقول اقبال کے کلام پر نظر ڈالتے ہی رفعتوں کی انتہا قاری کو حیرت زدہ کر دیتی ہے اور فن کو بے چون وچرا تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا۔ عہد موجود میں طاقت کا راز ٹیکنالوجی میں پوشیدہ ہے جن ممالک کے پاس جدید ٹیکنالوجی موجود ہے وہ دنیا کے حکمران ہیں نیز یہ کہ حصول علم کے بغیر ٹیکنالوجی کا حصول ممکن نہیں۔ علم کی اسی مسلمہ اہمیت کے پیشِ نظر اقبال نے علم کی ماہیت، ضرورت، اقسام اور طرزِ تدریس کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ طریقہ درس وتدریس میں ہر لحہ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور ابھی تک تعلیم کا طریقہ کار تختہ مشق بنا ہوا ہے۔ ایک صدی پہلے اقبال کی پیش کردہ تعلیمی بصیرت کو ہم آج تسلیم کرنے کے لیے مجبور نظر آتے ہیں۔ اقبال نے ایک خط میں لکھا تھا: "علم کا مدار حواس پر ہے جس سے طبعی قوت حاصل ہوتی ہے اس قوت کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے، ورنہ

علم و آگہی سب شیطانی وساوس ہیں اگر علم سے اسوہ حیات میں انقلاب نہ آئے تو کار ہوس ہے ہر تعلیم نظام اخلاق کے تابع ہے۔ تمام اخلاق کا مصدر قادرِ مطلق ہے اس کا اقرار و عرفان ہی تعلیم و تربیت کی روح ہے۔ یہ الفاظ دیگر یہی درس آدمیت ہے جو میلاد آدم کا منشاو منشور ہے اگر یہ نہ ہو تو دانش و بینش کے مینار و منبر دوکانِ شیشہ گر کے مانند ہیں۔"[2]

پروفیسر عبدالحق کے خیال میں اقبال کے فلسفہ و شعر کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ وہ قاری کے فکر و شعور اور قلب و نظر کی دنیا بدل دینے کی مخلصانہ اور موثر کوشش بھی ضرور کرتے ہیں۔ بہت سے ادیب اور شاعر اقبال کی شاعری سے دور اس لیے رہنا چاہتے تھے کیوں کہ اقبال کے مطالعے کے بعد ان کی شعری سحر کاری سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ پاتے۔ اگر دیکھا جائے تو تعلیم اور تربیت کے ارتباط سے ہی کامیابی کے خوش گوار نتائج حاصل ہو سکتے ہیں اور اسی سے ہی علم و عمل کا آپس میں ربط مستحکم ہوتا ہے۔ تعلیم جیسی بھی ہو روایتی، غیر روایتی، قدیم و جدید، مشرقی یا مغربی کتابی یا عملی طلبا و طالبات سب کے لیے یکساں چیز تربیت ہے اور تربیت بھی تعلیم کے بنا موثر نہیں ہوتی اور نہ ہی اس سے مثالی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ قلب و نظر کے ادراک کے لیے تخمین و ظن سے معمور تعلیم پر بھروسہ بھی محض خود فریبی ہے۔ اقبال کے کلام میں جا بجا ایسے تاکیدی اشارے نظر آتے ہیں جن میں تربیت کے فقدان کا ذکر ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

بندہ تخمین و ظن کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

پروفیسر عبدالحق کے مطابق اقبال کے ہاں ماضی کی مثالیں کثرت سے نظر آتی ہیں جو تلمیحات سے قطع نظر جہاد زندگی کو نور فشاں بنا دیتی ہیں۔ ان کے خیال میں تعلیم گاہوں کو مناظر فطرت کی کھلی فضا چاہیے جہاں فطرت کے مقاصد کی نگہبانی ممکن ہو سکے۔ مقاصد حیات کی تکمیل فیضان نظر کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک صاحبِ کردار ہی مثالی نمونے کے ذریعے تربیت کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے جو خود علم و عمل کی صداقت سے آشنا ہو۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

مغربی تعلیم سے استفادے کی سفارش

مشرق و مغرب کے قدیم و جدید علم کی آمیزش کو اقبال نے نقطہ نظر کا مرکزِ التفاف کہا جا سکتا ہے۔ اقبال یہ حقیقت اچھی طرح جانتے تھے کہ جدید تعلیم سے شناسا ہوئے بغیر نہ توامتِ مسلمہ اپنی بقا کی جنگ لڑ سکتی ہے اور نہ ہی تسخیر کائنات کے حکم خداوندی سے بہرہ ور ہو سکتی ہے۔ اس لیے وہ مغرب سے استفادہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ اقبال کے خیال افروز تصورات کے شاعرانہ اظہار کے لیے ان کی مقبول نظم "شعاع امید" کا آخری شعر ملاحظہ فرمائیں :

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے عذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

پروفیسر عبدالحق کے خیال میں دین اور دنیا کے علاوہ مشرق اور مغرب کی تفریق نے بھی انسان کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ اقبال کے خیالات میں تدریجی اور ارتقائی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جس کی بنا پر تعلیم سے متعلق بھی انقلابی ارتقا رونما ہوا۔ انکی نظم "فلاح قوم" میں ان کے تعلیمی تصورات کی بھرپور تصویر نظر آتی ہے جس میں حصول علم کے لیے تمام مزاحمتوں کو برداشت کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

جو دوڑ کے لیے میدان عمل میں جائیں
سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں
دکھائیں فہم و ذکاو ہنر یہ اوروں کو
زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم و فنون

ترک دنیا کی مذمت

پروفیسر عبدالحق کے بقول اقبال نے علوم کو دین اور دنیا کے خانوں میں منقسم نہیں کیا بل کہ ان کے نزدیک یہ فکر گمراہی کا سبب ہے۔ وہی علم تو عزیز تر ہے جو کہ عرفان نظر اور قلب و روح کو فلاح انسانی کے لیے وقف کرکے معاشرے کو روحانی و مادی اقدار سے سرفراز کر دے۔ تعلیم کی یہی فضیلت جو اقبال کے نظام فکر میں مختلف پہلوؤں سے زندگی کا نقش بن کر ابھرتی ہے یہ نہ صرف زمان و مکان کی حدود سے آزاد ہے بل کہ اس پر نہ قدیم و جدید کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ ہی مشرق و مغرب کا۔ اقبال کے خیال کی گہرائی اور بے کراں کیفیات ہی تو ہیں جنھوں نے فکرِ اقبال کو آفاقی افق سے ہمکنار کر دیا ہے۔اقبال تو دین کی تعلیم کو بھی فلاح انسانیت سے منسلک کرنے کے خواہاں ہیں۔ وہ حرکت و عمل کے قائل ہیں، اس لیے ترکِ دنیا کی تعلیم کی مذمت کرتے نظر آتے ہیں۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

اقبال کا مخاطب اول نوجوان طلبا ہی تو ہیں۔ طلبائے علی گڑھ کے نام، جاوید کے نام، ایک نوجوان کے نام، خطاب بہ جوانانِ اسلام، اسلامیہ کالج کا خطاب وغیرہ یہ ان کی نظموں سے ہیں۔ عام انداز گفت گو اسی بات کی تو دلیل ہے۔پروفیسر عبدالحق رقم طراز ہیں: "حکمت و دانائی کے گہر ہائے آب دار سے دامنِ علم کو بھرنے کی خواہش نے اقبال کو ہمیشہ بے قرار کیا۔"[3]

ہاں دعا کن بہر ما، اے مایہء ایمانِ ما
پُر شود از گوہرِ حکمت سرِ دامانِ ما

پروفیسر عبدالحق نے ایک مضمون میں بڑی بلیغ بات لکھی ہے کہ اسلام ایک خالص تعلیمی تحریک ہے۔ خطبہ جمعہ و عید، حج، وعظ، غرض تعلیم و تربیت کے بے شمار مواقع اسلام نے بہم پہنچائے ہیں۔اقبال کے بقول جوانوں کی تربیت اور فکر ساز قوتوں کو ابھارنے کے لیے نصاب کو بھی تعمیری اور فکری عناصر سے مزین ہونا چاہیے۔اچھی تربیت کے لیے مثالی نصاب لازم ہے عیش و آسائش سے بھرے درس و تدریس کے سلسلے فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتے۔ایک مسلمان نوجوان کی تربیت اس نہج پر ہونی چاہیے کہ وہ خلیفتہ اللہ کے منصب پر فائز ہے اور اُسے باطل قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہونا ہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے خاص نصاب ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔اس حوالے سے اقبال کا یہ شعر قابل توجہ ہے:

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات

اقبال انگریزی سرکار کی تعلیمی حکمت عملی سے کبھی بھی مطمئن نہیں تھے۔ تعلیم کو ملازمت سے مربوط کرکے غلامی کی ایک نئی تدبیر کا وجود اقبال کے لیے ناقابل برداشت تھا۔اقبال اس طرزِ عمل سے نہ صرف سخت بیزار تھے بل کہ اس نظام تعلیم پر کڑی تنقید کرتے ہوئے اسے زہر قاتل سمجھتے ہیں۔ جو محض حصولِ روزگار کا ذریعہ ہو اور اس میں کردار سازی کا پہلو تشنہ ہو۔اسی لیے وہ کہتے ہیں:

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ غلامی میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے۔غلام قوم کی یہ دوسری غلامی آزادی فکر و ضمیر کے لیے زہرِ قاتل ثابت ہوئی۔اس موقع پر بھی اقبال بھرپور مخالفت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال کے خیال میں تعلیمی پسماندگی تو غلامی سے بھی بدتر ہے۔ پروفیسر عبدالحق اقبال کے حوالے سے رقم طراز ہیں: "سنجیدہ طالب علم کو اقبال کے مطالعہ میں اس طرح کے مسائل سے کبھی کبھی دوچار ہونا پڑتا ہے یہ حقیقت ہے کہ ان کے سینے میں افکار کا ایک آتش کدہ روشن ہے جو ظاہر ہونے کے لیے بے چین رہتا ہے کبھی کبھی اقبال پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میرے سینے میں شمع نفس فروزاں ہے مگر گویائی اجازت نہیں دیتی یا یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر مجھ کو پرکھنا چاہتے ہو تو میرے دل کے اندر جھانک کر دیکھو شاید مجھ تک رسائی ہو۔"[4]

تعلیم جو شعور کو بلندی عطا کرتی ہے جو صلۂ دو کفِ جو کے عوض فروخت کی جارہی ہو، قوم کو شکم پروری کی آغوش میں سلایا جارہا ہو تو کیسے ممکن ہے کہ اقبال قوم کی درست سمت میں رہنمائی نہ فرمائیں۔

اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا

ہے خون فاسد کے لیے تعلیم مثلِ نیشتر

پروفیسر عبدالحق کے بقول اقبال روایتی طرزِ تعلیم کے بھی خلاف تھے۔ وہ طرزِ تعلیم جو آزادی فکر کو سلب کرے اور فضول قسم کی بحث میں نئی فکر پر پابندی میں جکڑ کر جسم کو بے روح بنادے یہ تعلیم ہر جگہ تقریباً ایک ہی جیسی ہے وہ مغرب ہو یا مشرق۔اگر ان کو خداوندانِ افرنگ سے گلہ ہے تو مدرسہ و خانقاہ کے سربراہان سے بھی شکایت ہے۔ موجودہ نظام تعلیم کا مشرقی تصور بھی اقبال پر گراں گزرتا ہے۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نم ناک
نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ
گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لاالہ الااللہ

یہاں پر مدرسہ سے مراد صرف اسلامی مدارس نہیں ہیں بل کہ مغربی علوم اور طریقہ تعلیم کی حامل درسگاہیں بھی ہیں جو ابتدا سے اعلیٰ سطح تک تعلیم دے رہی ہیں۔اقبال یہ چاہتے ہیں کہ ملک و قوم کا ہر فرد تعلیم یافتہ ہو اور انھوں نے اس کا جواز عقائد و اعمال سے فراہم کیا جس کے لیے اسلام نے ایک لائحہ عمل مقرر کیا ہوا ہے۔فلاحی ریاستوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ ملک کا ایک بھی بچہ کسی بھی وجہ سے ناخواندہ نہ رہے۔ سوسال بعد آج کے جمہوری نظام اور قوانین میں لازمی تعلیم کے اصول کو آئین کا حصہ قرار دیا جاچکا ہے۔خاص طور پر ترقی پذیر ملکوں میں اسے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔فکرِ اقبال کے اس پہلو میں بڑی دلکشی ہے کہ آج کے منظر نامے میں لازمی تعلیم کو بہت اہمیت دی جارہی ہے۔اقبال کے تعلیمی تصورات اور تربیتی منشور کے حوالے سے پروفیسر عبدالحق بیان کرتے ہیں: "مشرقی درسیات کے دائرہ کار کی زمانہ قدیم سے دورِ جدید تک کی تاریخ اقبال کے پیش نگاہ تھی اسلام کی تعلیم پر حد درجہ توجہ اور پیغمبر اسلام کی ہدایتیں اقبال کی گرویدگی کا باعث بنیں وہ درس نظامی کے آفاقی نصاب اور تدریس کے طریقہ کار سے بھرپور واقفیت رکھتے تھے اور عیب و ہنر بھی نظر میں تھے۔ مغربی نظام تعلیم کے آغوش میں پرورش پائی۔انھیں اس کے نفع و ضرر سے کماحقہ آگہی حاصل تھی۔ان کے مشاہدے میں مشرق و مغرب کی درس گاہوں کے ساتھ فکر ساز ماہرین تعلیم اور مفکرین بھی تھے۔"[5]

دوسرے تمام تصورات کی طرح تدریس اور تربیت کا مرکز و مصدر بھی خودی ہے جس کے اثبات اور استحکام میں اس اساسی عنصر کو سب سے زیادہ عمل دخل ہے۔جب خود آشکار ہوتی ہے وہ ایک زندہ و جاوداں پیکر کی صورت اختیار کرتی ہے جسے انسانِ کامل کہا جاتا ہے۔خودی کی آگہی اور انوار کے زیر سایہ تعلیم و تربیت کے سبب وہ مثالی انسان بنتا ہے۔ علم و آگہی کی سیرابی اس کی سرشت میں شامل ہے

علم از سامانِ حفظِ زندگی است

پروفیسر عبدالحق کے خیال میں پروفیسر محمد حبیب الدین احمد کی کتاب "علامہ اقبال کا نظریہ تعلیم" 1984ء میں منظر عام پر آئی جس سے اقبال کے نظریہ تعلیم کے متعلق نقطہ نظر سے آگاہی ہوتی ہے۔ اگرچہ اقبال تعلیمی مفکر نہ تھے اس کے باوجود آپ نے مدرسہ، طلباء واساتذہ اور نصاب کی خوبیاں اور خامیاں متعارف کروائی ہیں۔ علامہ اقبال کے تعلیمی مقاصد ان الفاظ میں بیان ہیں: "اقبال کے نزدیک تعلیم کا اولین مقصد یہ ہے کہ طلباء اپنے دینی مذہب اور نظریہ حیات سے آشنا ہوں وہ زندگی کے صحیح مفہوم اور مقصد دنیا میں انسان کی حیثیت کو سمجھتے ہوں۔"[6]

فلسفہ جہاد

پروفیسر عبدالحق کے بقول اقبال حرکت و عمل کے قائل ہیں۔ ان کی ایک بڑی پہچان فلسفہ خودی بھی ہے جس سے تمام تصورات روشن ہو کر حرف و صوت کی روح میں اتر جاتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک کائنات کا ہر ذرہ اس کی موجودگی سے متحرک اور منور ہے۔ یہ خودی جو شعوری احساس یا ادراک کا ایسا نام ہے جو بذات خود ظاہر نہیں ہے۔ اگرچہ یہ چھپا ہوا ہے مگر اپنے عمل کی رو سے مرئی یا مادی صورتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ خودی کا مقصود تعمیر و تخلیق ہے اسی سے خودی لافانی اور لازمانی ہو کر لازوال ہو جاتی ہے۔ جدوجہد کا مسلسل جاری رہنا ہر قسم کے نتائج "کشور کشائی یا مال غنیمت" سے بے نیاز ہو کر اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

عام مشاہدے کی بات ہے کہ صداقت کو منوانے کے لیے طاقت اور قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام نے کفار کے خلاف اپنی طاقت جمع رکھنے کا حکم دیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق کے بقول اقبال نے کئی اصطلاحات کو مخصوص معنوں میں استعمال نہ کرکے انھیں عمومی اور اپنے طور پر استعمال کیا ہے اور ان میں سے ایک نیا مفہوم دینا چاہا ہے۔ ان کے خیال میں فیضان قوت کے بغیر وجود یا خارجی مظاہر کی تسخیر ممکن نہیں ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر عبدالحق بیان کرتے ہیں:

"فکر اقبال میں تسخیر فطرت ایک اہم ترین نکتہ ہے اسی قوت تسخیر سے بالائے افلاک یا سطح زمین اور سیاروں کا عالم امکان غرض سبھی بشریت کی زد میں رہتے ہیں۔ یہی قوت شب کی سیاہ راتوں میں قندیل روشن کرتی ہے یہی مسجد قرطبہ اور اہرام مصر اس کے لیے آلاتِ حرب و ضرب کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہاں خون ریزی و خون بہا دونوں ممنوع اور مسترد ہیں۔ اس میں نہ جیت ہے نہ ہار"[7]

پروفیسر عبدالحق کے خیال میں اگر مقاصد صالح اور صحت بخش ہوں تو ہر عمل بقائے بشریت کا ضامن بن جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو قبائے انسانی کی آبرو تار تار ہو جاتی ہے۔ اقبال نے ضرب کلیم میں بڑی بے باکی کے ساتھ دو ٹوک لفظوں میں تاریخ و تفکر کی روشنی میں تصور جہاد کی ایک بہت بڑی حقیقت کو بیان کیا ہے۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں

سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں نشہ قوت ہے خطرناک
لادین تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

قوموں کے لیے عظیم اخلاقی اقدار کی پابندیاں لازم ہیں لیکن دست قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق بھی بیداری عزائم سے جنم لیتی ہے کم زور بازووں سے بغاوت اور بیداری نہیں پیدا ہوا کرتی۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

پروفیسر عبدالحق کے خیال میں یہ تصورِ جہاد اقبال کی وسعت فکر کی طرف اشارہ کرتا ہے جو عہد اقبال کا سب سے اہم مطالبہ اور ضرورت تھی مغربی آقاں کے خلاف اور آزادی کی بحالی کے لیے خون کو گرمانے کے لیے اس جذبہ جہاد کی ضرورت بھی تھی گویا غلام قوم کے لیے حصول آزادی کے لیے جدوجہد بھی جہاد ہے طاغوتی طاقتوں کے خاتمے کے لیے جہاد سے بڑھ کر کوئی اور شے نہیں ہو سکتی جسے زندگی سے بھی زیادہ عزیز قرار دیا جاسکے یہی وجہ تھی کہ اقبال نے علامت کے طور پر بھی شاہین کو پسند کیا۔ حالاں کہ یہ علامت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ طلب وہ طاقت ہے جو شاہین کے علاوہ کم ترین پرندوں میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ لہو گرم ہو تو فاختہ بھی شاہینی صفات کی حامل بن سکتی ہے۔ پروفیسر عبدالحق رقم طراز ہیں: "یقین و عمل کے سوز و ساز سے ہر بے مایہ کی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے یہ صرف لذتِ پرواز پر موقوف ہے شاہین اگر کرگسوں میں پلا ہو یا زاغ و زغن کی صحبتوں کا پروردہ ہو تو قابل نفرت ہے اور اگر اس کی خودی صورتِ فولاد مستحکم ہو تو کائنات کا ہر ذرہ مہر و ماہ کو تاراج کرنے کے لیے کافی ہے۔ دراج کے سینے میں نفس گرم پیدا کرکے اقبال یارانِ چمن کو معرکہ بازی کے لیے آمادہ کرتے ہیں یہ بھی ترغیب جہاد کی ایک صورت ہے۔ پیام مشرق کی نظم شاہین و ماہی، میں بچہ ماہی شاہین کو للکارتا ہے۔

ہر لحظہ جوان است و روان است و دوان است
از گردش ایام نہ افزوں شد و نے کاست "[8]

فکر اقبال کا ایک اور نکتہ جسے پروفیسر عبدالحق نے بخوبی آشکار کیا ہے وہ حصولِ تعلیم کے ساتھ حصولِ قوت ہے۔ ان کے بقول اقبال نے شدت سے محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کے مردہ جسم میں نغمہ داود سے ہلچل نہیں پیدا ہو سکتی حیاتِ نو اور غلامی سے نجات کے لیے بھی ضرب کلیم بہت ضروری ہے۔ ضرب شاہی کے سنگین آلات کو کسی پیش رفت کے بغیر واپس لوٹا دینا ہی جہاد ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے جس میں دانت کے بدلے دانت اور زخم کے بدلے زخم سے تجاوز نہ کرنے کی سخت تاکید ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ الحج کی آیات کے تاکیدی کلمات میں بھی بڑی

وسعت ملحوظ خاطر ہے۔ "اور محنت کرو اللہ کے واسطے جیسی کہ چاہیے اس کے واسطے" جہاد ہر جگہ شمشیر و سناں کا محتاج نہیں ہوتا بہت سی جہاد کی اقسام جیسے قلم کا، زبان کا، نفس وغیرہ کا یہ سب کے سب ہی برائی کے خلاف مثالی معاشرے کے استحکام کے لیے ضروری ہیں۔

پروفیسر عبدالحق کے خیال میں اقبال چونکہ اس سے پہلے ایشائی انگڑائی کو لبیک کہہ چکے ہیں اور اب ہندوستان کے مغربی آقاوں کے خلاف انقلابی آواز کی سخت ضرورت تھی ایسا پیغام جہاد جس سے وطن کی حرمت بحال ہو سکتی۔ اقبال کا تصور جہاد صرف مفسد انسانوں کے خلاف نبرد آزمائی نہیں بل کہ خارجی مظاہر میں خود فطرت کے خلاف بھی یہ عمل جاری رکھنا ضروری ہے اور اگر بیرونی وجود میں مزاحمتوں کا سامنا ہو تو انھیں خاکستر کر کے نئی دنیا آباد کرنے کی تاکید اور ارض وسما کو پھونک ڈالنے کی بات بھی اقبال کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ اقبال کے نزدیک ناتوانی و ناکسی سب مرگ حیات ہیں۔ اقبال کے وسیع تصورات کے یہ پہلو ان کی اجتہادی فکر کے سب سے روشن اوراق ہیں:

اندرونم جنگ بے فیل و سپہ
بیند آں کو ہم چو من دارد نگہ

درحقیقت انسانی فطرت میں شامل شیطانی قوتوں کو شکست دینے کے لیے یہ جنگ ضروری ہوتی ہے وجود کی انھی بے لگام قوتوں کے سہارے دنیا میں فتنہ و فساد بارہا برپا ہوئے۔

جنگ شاہان جہاں غارت گری است
جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است

پروفیسر عبدالحق رقم طراز ہیں: "یہ غزوات بنی نوع بشر کی بقا اور خیر کثیر کے فروغ کے لیے جائز قرار دیئے گئے ہیں جس میں انسان کے ساتھ بے زبان چوپایوں، کشتِ دہقاں اور باغ و راغ کو تحفظ بخشنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ یہ جہاد دوستی و دردمندی کو خوش آمدید کہنے کے لیے ہے۔ یہ ترک دنیا کر کے دوست کے کوچے کی طرف گامزن ہونے کا نام ہے۔ اقوام عالم کے لیے اس حرفِ شوق کا پیغام عام کرنے کی ضرورت پر اقبال نے زور دیا ہے۔

آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت
جنگ را رہبانی اسلام گفت"[9]

اقبال کے تصورات کو سمجھنے کے لیے عقل رسا اور وسعت نظری کی ضرورت ہے۔ تصور اقبال کی تفہیم ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اقبال نے انتہائی خیال افروز اور آفاقی پہلو کی طرف توجہ دلائی جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ جہاد کے بنیادی تصورات خودی کے تابع ہیں اور اپنے وجود یا خودی کی نفی کرنے والے کے خلاف جہاد کا جواز بنتا ہے۔ اقبال کے خیال میں عظمتِ آدم سے انکار ناممکن ہے۔ پروفیسر عبدالحق کے خیال میں اقبال کا جہاد جارحانہ نہیں مدافعانہ ہے امن عالم کی بحالی اور صلح و آتشی کے لیے سراپا نیاز مند ہونا ہی جہاد ہے۔ ہر حال میں شیوہ اخلاص کو پیش نظر رکھنے پر زور دیا

ہے۔ پروفیسر عبدالحق کے خیال میں اقبال کو انسانوں سے پیار کرنے والے فلسفوں اور انسانی پیکروں کی بہت آرزو رہی ہے۔اسی حوالے سے پروفیسر عبدالحق رقم طراز ہیں:

> "ایسے انسانوں کی خواہش یا آرزو بھی اسباب جہاد میں شامل ہے کیوں کہ تمنائیں تلواروں کی چھاوں اور سایہ سپر میں پروان چڑھتی ہیں اور مشتِ خاک کو پیکار حیات کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔ حوصلوں کا دلوں میں موج رواں بن کر صالح مقاصد کے لیے ستیزہ کار رہنا جہاد کی ہی علامت ہے۔ اقبال کی اس تعبیر سے ہم اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن ان کی فکر و نظر میں اس خیال انگیز پہلو کی بڑی معنویت ہے۔ پیام مشرق کے اس پُر اسرار شعر کی یہی تعبیر کی جاسکتی ہے۔
>
> تیر وسناں و خنجر و شمشیرم آرزوست
>
> با من بیا کہ مسلکِ شبیر آرزوست"[10]

دنیائے فکر میں اقبال کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فکر و نظر کی بنیاد عظمت آدم پر رکھی۔خودی در حقیقت بلندی و برتری کے احساس کا نام ہے یہی احساس اسے کائنات میں محترم ٹھہراتا ہے۔ اقبال کے نزدیک خدا کے بعد سب سے برگزیدہ ہستی انسان کی ہے جس کے سامنے فرشتے بھی سر بہ سجود ہیں۔

آدمیت احترام آدمی
با خبر شواز مقام آدمی

خلاصۂ بحث

حاصل کلام یہ ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالحق نے امت مسلمہ کی نشاۃ الثانیہ کے حوالے سے فکرِ اقبال کے جن پہلووں کو اجاگر کیا ہے ان میں تعلیم کا موضوع سر فہرست ہے۔ اقبال جدید تعلیم کے بھرپور حامی ہیں اور تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت نفس اور کردار سازی کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک جدید تعلیم سے آراستہ ہوئے بغیر وقت کے تقاضوں سے کماحقہ عہدہ برآ نہیں ہوا جاسکتا۔ اس لیے وہ مغرب سے تعلیمی استفادے میں کوئی عار نہیں سمجھتے لیکن وہ امت مسلمہ کے لیے ایسا نصاب مرتب کرنے کے حق میں ہیں جو ان میں احساسِ خودی اور خلافت ارضی کا جذبہ ابھارنے میں کلیدی کردار ادا کرے۔ امتِ مسلمہ کی بحالی کا دوسرا پہلو حصول قوت کے ساتھ مشروط ہے۔ حصولِ قوت کا سرچشمہ فلسفہ جہاد میں مضمر ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان شر کی داخلی و خارجی طاقتوں سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔آخری بات جو ڈاکٹر عبدالحق نے فکرِ اقبال سے کشید کی ہے وہ فلسفہ حرکت و عمل ہے۔ مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے بعد ہی اپنا تشخص برقرار رکھنے کے قابل ہو سکیں گے۔

References

---

[1]Professor ʿAlī Ahmad, "Iqbāl Shāir-i-Rangeen Nawā: Aik Jāʾiza." In Professor Abdul Haq, Khayāl-i-Yār-i-Mihrbān (Delhi: Kingsway Kamp, 2013), 160.

[2] Professor Abdul Haq, *Iqbāl Kā Ḥarf-i-Shīreen* (New Delhi: Amila Press, 2014), 44.

[3] Abdul Haq, *Iqbāl Kā Ḥarf-i-Shīreen*, 50.

[4] Professor Abdul Haq, *Allāmā Iqbāl* (Delhi: Urdu Akadamī , 2016), 26.

[5] Abdul Haq, *Iqbāl Kā Ḥarf-i-Shīreen, 54.*

[6] Muhammad Ḥabīb al-Dīn Ahmad, Allāma Iqbāl Kā Nazria-i-Taʿlīm (New Delhi: Markazī Maktaba Islāmī, 1986). 20.

[7] Professor Abdul Haq, Iqbāl Shāir-i-Rangeen Nawā,124.

[8]Professor Abdul Haq, Iqbāl Shāir-i-Rangeen Nawā, 126.

[9] Professor Abdul Haq, Iqbāl Shāir-i-Rangeen Nawā, 130

[10] Professor Abdul Haq, Iqbāl Shāir-i-Rangeen Nawā,132.